Dr. Rubina Yasmeen
Assistant Professor, Department of Urdu,
Sarhad University of Science and
Information Technology,
Peshawar

ڈاکٹر روبینہ یاسمین
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو،
سرحد یونیورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، پشاور

پیغمبرِ اسلام میں عقیدت، انقلاب اور احیائے ملت کا شعور

Devotion, Revolution, and the Consciousness of Revival in Paighambar-e-Islam by Josh Malih Abadi

Abstract: This article presents a critical analysis of Josh Malih Abadi's long Naatia poem Paighambar-e-Islam. It explores the poem's intellectual depth, artistic grandeur, and revolutionary zeal. The study shows that the poem transcends conventional praise, becoming a manifesto for moral and spiritual revival. Josh emphasizes that love for the Prophet Muhammad ﷺ is not passive devotion but a dynamic, transformative force. Historical Islamic figures such as Ali, Hussain, Salman, and Abu Dhar are depicted as living symbols of courage, sacrifice, and integrity. The poem intertwines spiritual passion with ethical and social consciousness, urging readers toward reform. Karbala is presented as an eternal struggle between justice and oppression, with Imam Hussain (رضی اللہ عنہ) as the model of steadfastness. Josh's elevated diction, metaphorical richness, and oratorical tone amplify the poem's emotional and ideological impact. The work blends devotion with civilizational and historical awareness, making faith actionable in the world. The poem critiques worldly ambition, greed, and superficial religiosity, advocating inner sincerity and ethical courage. It demonstrates that true honor lies in selflessness, moral steadfastness, and spiritual insight rather than temporal power. The analysis highlights the poem's unique integration of naat with social, ethical, and revolutionary consciousness. Faith, love, and courage are presented as inseparable, guiding the believer toward both personal and communal awakening. The poem redefines naat as a literary form that inspires moral rectitude, spiritual renewal, and collective resurgence. Ultimately, Josh's work elevates natia poetry into a powerful vehicle of ethical, spiritual, and historical enlightenment.

Keywords: Natia Poetry, Prophet Muhammad (ﷺ), Karbala, Imam Hussain (رضی اللہ عنہ), Spiritual Revival, Ethical and Social Consciousness, Islamic Historical Figures.

جوش ملیح آبادی (۱۸۹۸–۱۹۸۲) اردو کے ممتاز شاعر اور ادیب تھے، جن کا اصل نام یوسف حسین تھا۔ وہ ملیح آباد کے رہائشی تھے اور بعد میں پاکستان ہجرت کر گئے۔ جوش نے اردو شاعری میں تحریکِ آزادی، انقلاب، ملتِ اسلامیہ کی بیداری اور انسانی جذبات کی ترجمانی کے لیے منفرد مقام حاصل کیا۔ ان کی شاعری میں جذبۂ ایمانی، حریتِ فکر، قومی شعور، اور سماجی انصاف کی جھلک نمایاں ہے۔ انھوں نے غزل، نظم، اور نعتیہ شاعری میں گہرائی اور ولولہ پیدا کیا اور نعت کے روایتی اسلوب کو ملی شعور اور انقلابی جذبے سے ہم آہنگ کر کے نئی معنویت عطا کی۔ جوش کا کلام صرف محبتِ رسول ﷺ اور مذہبی عقیدت تک محدود نہیں بلکہ اس میں انسانی کردار سازی، اخلاقی بلندی، اور تاریخی شعور کی بھی دعوت موجود ہے۔ ان کی شاعری نے اردو ادب میں خطیبانہ، پر شکوہ، اور فکری لحاظ سے بلند لہجہ متعارف کروایا، جو آج بھی قاری کے دلوں کو متحرک کرتا ہے۔

جوش ملیح آبادی کی نعتیہ نظم ''پیغمبرِ اسلام'' اپنے اندر جذبۂ ایمانی، حریتِ فکر اور روحانی وارفتگی کا ایسا سیلِ رواں رکھتی ہے جو قاری کے باطن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ محض نعت نہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ کے احیاء کی ایک ولولہ انگیز دعا اور انقلابی منشور کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نظم حیدر آباد (دکن) کی ایک محفلِ میلاد کے لیے بہت عجلت میں عین میلاد کے موقع پر لکھی گئی تھی۔ نظم کا آغاز ایک پُر سوز مناجاتی آہنگ سے ہوتا ہے:

اے خدا سینۂ مسلم کو عطا ہو وہ گُداز
تھا کبھی حمزہ و حیدر کا جو سرمایہ ناز
پھر فضا میں تری تکبیر کی گونجے آواز
پھر اس انجام کو دے گرمی روحِ آغاز
نقش اسلام ابھر جائے جلی ہو جائے
ہر مسلمان حسینؑ ابن علیؑ ہو جائے
دشتِ اسلام کے کانٹوں کو گلستاں کردے
پھر ہمیں شیفتہ جلوہ ایماں کر دے(۱)

یہ گداز دراصل وہی سوزِ دروں ہے جو عشقِ رسول ﷺ سے جنم لیتا ہے اور جس نے کبھی حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ کے کردار کو امتیاز بخشا تھا۔ جوش ماضی کی عظمت کو محض حسرت و نوحہ کا عنوان نہیں بناتے بلکہ اسے ایک زندہ سرچشمہ سمجھتے ہوئے احیائے ملت کی تمنا کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام کا عروج کوئی قصۂ پارینہ نہیں بلکہ ایک متحرک اور قابلِ حصول حقیقت ہے، جو ایمان، کردار اور عملی جدوجہد سے دوبارہ جلوہ گر ہو سکتی ہے۔ نظم میں مولا حسینؓ اور حضرت علیؓ جیسے عظیم المرتبت کرداروں کا حوالہ رسمی عقیدت تک محدود نہیں رہتا بلکہ ایک اخلاقی و عملی نمونے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ شاعر کی خواہش ہے کہ حضرت علیؓ کی جرأت و حکمت اور مولا حسینؓ کی شجاعت و ایثار پھر سے امت کے مزاج اور اجتماعی شعور کا حصہ بن جائیں، تاکہ تاریخ کا وہ روشن باب حال کی تاریکیوں کو منور کر سکے۔ یہ اشعار ولولہ انگیز نعتیہ آہنگ اور خطیبانہ شان کے حامل ہیں، جن میں بعثتِ رسولِ اکرم ﷺ کو کائناتی انقلاب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ شاعر نے طلوعِ آفتاب، پو پھٹنے، شب کے اندھیرے کے چھٹنے اور دریائے نور کے انگڑائی لینے جیسے بلیغ استعارات کے ذریعے حضور ﷺ کی آمد کو محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ عالمگیر روشنی، فکری بیداری اور روحانی احیا کا استعارہ بنا دیا ہے۔ اس اسلوب میں تصویریت بھی ہے اور فکری وسعت بھی، جو قاری کے احساسات کو مہمیز دیتی ہے۔ "وہ عرب کے

مطلعِ روشن سے ابھرا آفتاب" میں جغرافیائی حوالہ اپنے اندر تہذیبی اور فکری معنویت بھی سموئے ہوئے ہے کہ عرب کی سرزمین سے طلوع ہونے والا یہ نور پوری انسانیت کے لیے پیامِ ہدایت بن گیا۔ اسی طرح "گرد بیٹھی کفر کی، اٹھی رسالت کی نگاہ" میں صنعتِ تضاد نہایت مؤثر انداز میں جلوہ گر ہے؛ ایک جانب باطل کی پسپائی اور دوسری جانب حق کی سربلندی۔ یہ فنی قرینہ نظم کی تاثیر کو دوچند کر دیتا ہے۔ شاعر رسولِ اکرم ﷺ کو "روحِ فطرت پر حکمرانی" رکھنے والا اور "موت کو زندگانی بنانے والا" قرار دے کر یہ واضح کرتا ہے کہ آپ ﷺ کی تعلیمات نے انسان کو خوف، جاہلیت اور سفاکی کی فضا سے نکال کر رحمت، عدل، اخوت اور حیاتِ معنوی کی سمت رہنمائی کی۔ "خون آشام تلواروں کو مرہم کر دیا" نہایت بامعنی اور علامتی مصرع ہے، جو اس انقلابی تبدیلی کی طرف اشارہ کرتا ہے جس نے جنگجو اور قبائلی معاشرے کو اخلاقی، مہذب اور انسان دوست معاشرے میں تبدیل کر دیا۔ اس طرح نظم محض مدح نہیں بلکہ ایک فکری اور تہذیبی منشور کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جس میں ماضی کی عظمت، حال کی اصلاح اور مستقبل کی امید ایک ہی تسلسل میں سمٹ آتی ہے۔ جوش کا انداز یہاں نہایت حماسی ہو جاتا ہے:

موت کیا شے ہے، بھلا موت سے ڈرنا کیسا؟
کوئی اس راہ میں مرتا بھی ہے، مرنا کیسا؟
مر کے بھی خون میں یوں موجِ بقا آتی ہے
کہ اجل سامنے آتی ہوئی شرماتی ہے(۲)

یہ تصورِ شہادت دراصل زندگی کے اعلیٰ ترین مقصد کی طرف اشارہ ہے۔ موت کو وہ شکست نہیں بلکہ بقائے دوام کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ یہی وہ فکر ہے جو کمزور قوموں کو زندہ اور زندہ قوموں کو سربلند کرتی ہے۔ اس بارے میں اقبال کا بھی یہی فرمان ہے:

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اَولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بُوئے اسَد اللّٰہی
آئینِ جوانمرداں، حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی(۳)

اقبال یہاں مادی طاقت کے مقابلے میں روحانی قوت کو برتر ثابت کرتے ہیں اور نوجوانوں کو جرأت، صداقت اور خودداری کا پیغام دیتے ہیں۔ اس میں خطیبانہ آہنگ بھی ہے اور فکری گہرائی بھی، جو اقبال کی شاعری کا خاص امتیاز ہے۔ یہاں دارا اور سکندر دنیاوی اقتدار، جاہ و حشمت اور فتوحات کی علامت ہیں، جب کہ مردِ فقیر روحانی عظمت اور باطنی استغنا کا استعارہ ہے۔ اقبال کے نزدیک اصل برتری ظاہری سلطنت میں نہیں بلکہ اس فقر میں ہے جس میں حضرت علیؓ (اسد اللہ) کی جرأت، شجاعت اور حق پرستی کی خوشبو ہو۔ یعنی ایسا فقیر بادشاہوں سے افضل ہے جو باطن میں علیؓ کی صفات رکھتا ہو۔ ان اشعار میں اقبال نے مردانگی کی اصل تعریف بیان کی ہے، سچائی اور بے خوفی۔ اللہ کے شیروں کی ترکیب شجاعتِ ایمانی کا استعارہ ہے، جب کہ روباہی؛ مکر و فریب اور بزدلی کی علامت ہے۔ اقبال واضح کرتے ہیں کہ ایمان والے میں عیاری اور خوف نہیں ہو سکتا۔ نظم کا

اصل محور عشقِ رسول ﷺ ہے۔ جوش کی شاعری کا امتیاز ان کا خطیبانہ اور طوفانی آہنگ ہے، جو اس نظم میں اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے، الفاظ میں خطابت کی گھن گرج، تراکیب میں جلال و جمال کا امتزاج اور دعا اور انقلاب کا حسین سنگم ہے، تشبیہات و استعارات نے نظم کو جمالیاتی حسن عطا کیا ہے۔ نظم اپنے مزاج اور پیغام کے اعتبار سے علامہ محمد اقبال کی احیائی فکر سے ہم آہنگ محسوس ہوتی ہے، لیکن جوش کا لہجہ زیادہ خطیبانہ، جذباتی اور آتشیں ہے۔ اقبال جہاں فلسفیانہ گہرائی سے بات کرتے ہیں، وہاں جوش ولولہ خطابت سے دلوں کو گرما دیتے ہیں۔ یہ نظم ملت کے زوال کا نوحہ نہیں بلکہ بیداری کا نقارہ ہے، اس میں دعا بھی ہے، انقلاب بھی، عشق بھی ہے اور عمل کی دعوت بھی۔ جوش نے نعت کے روایتی اسلوب کو ملی شعور، حریتِ فکر اور انقلابی جذبے سے ہم آہنگ کر کے اسے ایک نئی معنویت عطا کی ہے۔ قاری کے اندر احساسِ زیاں کو بیدار کر کے اسے کردار سازی، عشقِ رسول ﷺ اور حیاتِ جہاد کے راستے پر گامزن کرنے کی کوشش کرتی ہے اور یہی اس کا سب سے بڑا ادبی و فکری کمال ہے۔ بقول شاعر:

صبحِ اسلام پہ ہے تیرہ شبی کا پَرتَو
لبِ مسلم سے ہٹا تشنہ لبی کا پَرتَو
کانپ کر ماند ہو راحت طلبی کا پَرتَو
ڈال سینوں پہ رسولِ عربی کا پَرتو
غُل ہو وہ حوصلہ شوق دوبارا نکلا
وہ چمکتا ہوا اسلام کا تارا نکلا
سوئے میخانہ توحید صدا دے ہم کو
عشق کا ساغر لبِ ریز پلا دے ہم کو(۴)

ان اشعار میں بھی یہی پیغام پوشیدہ ہے کہ ملت کی بیداری کا سرچشمہ عشقِ مصطفیٰ ﷺ ہے اور یہی عشق عمل، جرات اور وحدت پیدا کرتا ہے۔ اس نعت کے اشعار عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کو فکری، اخلاقی اور تہذیبی انقلاب کے تناظر میں پیش کرتے ہیں اور نعتیہ شاعری کو ایک آفاقی جہت عطا کرتے ہیں۔ شاعر حضور اکرم ﷺ کو محض روحانی پیشوا نہیں بلکہ قانونِ الٰہی کے عملی مظہر اور انسانی تہذیب کے معمار کے طور پر دیکھتا ہے۔ جس کا ہر اک سائنس قانونِ الٰہی میں یہ تصور نمایاں ہے کہ آپ ﷺ کی تعلیمات محض مذہبی احکام نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہیں جو عقل و فطرت سے ہم آہنگ ہیں۔ اسی طرح قلبِ تیرگی سے نور پیدا کر دیا اور مردوں کو مسیحا کر دیا جیسے استعارات اس انقلابی تاثیر کی علامت ہیں جس نے مردہ دلوں کو حیاتِ تازہ عطا کی اور منتشر معاشرے کو بامقصد امت میں بدل دیا۔ شاعر کا لہجہ پر شکوہ اور خطیبانہ ہے؛ وہ اعلان کرتا ہے کہ زمانے کی کروٹیں اور آندھیاں بھی اس چراغِ ہدایت کو بجھا نہیں سکتیں۔ یہ استعارہ دوامِ رسالت اور ابدیتِ پیغام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ نسل و رنگ کے امتیاز کا مٹ جانا اور اخوت کی بنیاد پڑ جانا اس سماجی انقلاب کی طرف اشارہ ہے جو آپ ﷺ نے برپا کیا جہاں انسانی مساوات اور عدل بنیادی اقدار قرار پائیں۔ شاعر نے نعت کو محض عقیدت کے دائرے سے نکال کر ایک تہذیبی و تاریخی شعور سے جوڑ دیا ہے۔ اس کی نظر میں حضور ﷺ کی ذات روشنی، مساوات، اخوت اور حیاتِ نو کی علامت ہے؛ یہی وجہ ہے کہ وہ آپ ﷺ کو زمان و مکان سے ماورا ایک ابدی سرچشمۂ نور کے طور پر پیش کرتا ہے۔

یہ نظم نعتیہ فضا کے اندر ایک نہایت معنی خیز موڑ کی نمائندگی کرتی ہے۔ شاعر ابتدا میں ولادتِ رسول ﷺ کی مسرت اور جشن کی کیفیت کو تسلیم کرتا ہے، یہ مسرت کا محل ہے مگر فوراً اس کے پس منظر میں موجود اجتماعی دکھ کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ یہی وہ داخلی کشمکش ہے جو ان اشعار کو محض مدح سے بلند کر کے ایک سماجی و اخلاقی شعور عطا کرتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ بزمِ طرب میں نالۂ جان فگار ناگوار سہی، لیکن دل پر اختیار نہیں؛ گویا عقیدت اگر سچی ہو تو وہ امت کے زخموں سے بے خبر نہیں رہ سکتی۔ بقول شاعر:

آگ سی روشن ہے اک قلب وجگر کے سامنے
لے کہے دیتا ہوں جو کچھ ہے ، نظر کے سامنے
اس ترے انبوہ میں اسے مسلم اند وہ گیں!
دیر سے موجود ہیں خود رحمت اللعالمیں
زیرِ لب فرما رہے ہیں وائے بر جانِ حزیں
کوئی بھی اتنوں میں میرا چاہنے والا نہیں(۵)

اس میں شاعر دراصل محبتِ رسول ﷺ کے دعووں اور عملی زندگی کے تضادات کو موضوع بناتا ہے۔ بظاہر عقیدت کے ہجوم، نعت خوانی، درود و سلام اور مذہبی نعروں کے باوجود جب سیرتِ نبویؐ کی حقیقی پیروی نظر نہیں آتی تو گویا رحمتِ عالم ﷺ کی طرف سے ایک خاموش شکوہ ابھرتا ہے کہ سچے پیروکار کہاں ہیں۔ یہ اسلوب ہمیں علامہ محمد اقبال کی نظم ''شکوہ ''اور ''جوابِ شکوہ ''کی یاد بھی دلاتا ہے، جہاں امت اور نبیؐ کے تعلق کو فکری اور اخلاقی پیمانے پر پرکھا گیا ہے۔ یہاں بھی شاعر محبت کو محض جذباتی وابستگی نہیں بلکہ اتباعِ سنت، اخلاقی پاکیزگی، عدل، امانت اور ایثار سے جوڑتا ہے۔ ہونٹوں پر ذکرِ دین اور دلوں میں دنیا کی گھاتیں، دراصل اسی داخلی تضاد کی علامت ہے۔ شاعر ملت کی ظاہری رسومات، خطابت، اور نمائشی دینداری کے مقابلے میں باطنی غفلت، مفاد پرستی اور دنیا طلبی کو نمایاں کرتا ہے۔ اس طرح نظم ایک تنبیہ اور اصلاحی پیغام بن جاتی ہے، اگر محبت سچی ہے تو وہ کردار، معاملات اور اجتماعی رویّوں میں بھی جھلکنی چاہیے۔ بقول علامہ اقبال:

تھے تو آبا وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو!(۶)

دوسرے حصے میں نظم ایک سماجی احتجاج کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ شاعر خدا کے حضور عرض کرتا ہے کہ کاش انہیں محسوس ہو سکے کہ کتنے دل درمندی سے چاک ہیں، کتنے معصوم بھوک اور محرومی کا شکار ہیں۔ یہاں نعت انسانی ہمدردی اور معاشرتی انصاف کا استعارہ بن جاتی ہے۔ شمع کی حاجت نہیں ہے محفلوں کے واسطے / کچھ چراغوں کی ضرورت ہو دلوں کے واسطے یہ مصرع دراصل اس بات کی علامت ہے کہ اصل روشنی تقریبات کی آرائش میں نہیں بلکہ دلوں کی اصلاح اور سماج کی فلاح میں ہے۔ یہ اشعار عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کو فکری، اخلاقی اور تہذیبی انقلاب کے تناظر میں پیش کرتے ہیں اور نعتیہ شاعری کو ایک آفاقی جہت عطا کرتے ہیں۔ شاعر حضور اکرم ﷺ کو محض روحانی پیشوا نہیں بلکہ قانونِ الٰہی کے

عملی مظہر اور انسانی تہذیب کے معمار کے طور پر دیکھتا ہے۔ جس کا ہر اک سائنس قانونِ الٰہی میں یہ تصور نمایاں ہے کہ آپ ﷺ کی تعلیمات محض مذہبی احکام نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہیں جو عقل و فطرت سے ہم آہنگ ہیں۔ اسی طرح قلبِ تیرگی سے نور پیدا کر دیا اور مردوں کو مسیحا کر دیا جیسے استعارات اس انقلابی تاثیر کی علامت ہیں جس نے مردہ دلوں کو حیاتِ تازہ عطا کی اور منتشر معاشرے کو بامقصد امت میں بدل دیا۔ شاعر نے آپ ﷺ کی دنیا میں آمد کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ کے آنے سے دنیا میں اخوت اور بھائی چارے کی فضا قائم ہوئی۔ بقول شاعر:

تیری پنہاں قوتوں سے آج بھی دنیا ہے دنگ
کس طرح تو نے مٹایا امتیازِ نسل و رنگ
ڈال دی تو نے بنائے ارتباطِ جام و سنگ
بن گیا دنیا میں 'تخئیلِ اخوت' ذوقِ جنگ
تیرگی کو روکشِ مہرِ درخشاں کر دیا
تو نے جس کانٹے کو چمکایا گلستاں کر دیا(۷)

شاعر کا لہجہ پر شکوہ اور خطیبانہ ہے؛ وہ اعلان کرتا ہے کہ زمانے کی کروٹیں اور آندھیاں بھی اس چراغِ ہدایت کو بجھا نہیں سکتیں۔ یہ استعارہ دوامِ رسالت اور ابدیتِ پیغام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ نسل و رنگ کے امتیاز کا مٹ جانا اور اخوت کی بنیاد پڑ جانا اس سماجی انقلاب کی طرف اشارہ ہے جو آپ ﷺ نے برپا کیا جہاں انسانی مساوات اور عدل بنیادی اقدار قرار پائیں۔ شاعر نے تاریخِ اسلام کے درخشاں کرداروں حضرت امام حسنؓ و حضرت امام حسینؓ اور حضرت علیؓ کے ذکر سے ایک اخلاقی و روحانی معیار قائم کیا ہے۔ قصۂ حسنین اور ضربِ حیدر محض واقعات نہیں بلکہ قربانی، شجاعت اور حق پر استقامت کی علامتیں ہیں۔ شاعر کا شکوہ یہ ہے کہ ہم ان عظیم ہستیوں کے واقعات تو سنتے ہیں مگر ان کی سیرت کو اپنی عملی زندگی میں نہیں اپناتے۔ یہی سبب ہے کہ کارواں تو موجود ہے مگر منزل کا نشان دکھائی نہیں دیتا؛ گویا امت حرکت میں ہے مگر سمت سے محروم ہے اس حصے میں لہجہ تنبیہی اور اصلاحی ہے، جو داخلی احتساب کی دعوت دیتا ہے۔ شاعر فطرت کے مظاہر ذرّات، گلستان، ہوا، خونِ زندگانی کے ذریعے اس ہمہ گیر نظامِ حیات کو بیان کرتا ہے جو ازل سے جاری ہے۔ مگر وہ واضح کرتا ہے کہ ان تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت آزاد آدمی ہے؛ یعنی وہ انسان جو شعور، حکمت اور بصیرت سے آراستہ ہو۔ یہ آزاد آدمی دراصل حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کا استعارہ ہے، وہ ہستی جس کے دل میں پیامِ فطرت پوشیدہ ہے، جس کی نگاہ نبضِ حیات پر ہے اور جس کی رہنمائی انسان کو جمود سے حرکت، اور تاریکی سے روشنی کی طرف لے جاتی ہے۔

شاعر نے ختمِ نبوت، صداقتِ رسالت اور باطل نظریات کی تردید کو نہایت زور دار اور استدلالی انداز میں پیش کیا ہے۔ ابتدا میں وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ حضور اکرم ﷺ کی عظمت کا معترف ہے گویا ازل سے آسمان بھی آپؐ کے نقشِ قدم پر سجدہ ریز ہیں مگر انسان کی ایک بڑی تعداد اب بھی بے اعتنائی اور انکار میں مبتلا ہے۔ یہی تضاد شاعر کے لہجے میں احتجاج اور درد پیدا کرتا ہے۔ شاعر جب لکھتا ہے کہ عرب کے افق سے طلوع ہونے والا یہ آفتابِ رسالت ظلمت کے کانٹوں کو سرخ پھولوں میں بدل گیا، تو یہ محض شعری مبالغہ نہیں بلکہ اس تہذیبی و اخلاقی انقلاب کا استعارہ ہے جو بعثتِ نبوی ﷺ کے ذریعے برپا ہوا۔ شاعر باطل دعوؤں پر سوال اٹھاتے ہوئے منطقی مثالیں دیتا ہے، کیا آگ پانی

سے مل سکتی ہے؟ کیا چٹان موتی اگل سکتی ہے؟ ان سوالات کے ذریعے وہ یہ واضح کرتا ہے کہ جھوٹا دعویٰ کبھی دائمی صداقت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس حصے میں شاعر اس امر پر زور دیتا ہے کہ جو شخص دوسروں کی حکمت کا خوشہ چیں ہو یا نبوت کا جھوٹا مدعی ہو، اس کا انجام مٹی کے ڈھیر سے زیادہ نہیں۔ سچائی وہی ہے جو صدیوں کے امتحان سے گزر کر بھی روشن رہے اور کروڑوں انسان جس کی گواہی دیں۔

نظم میں صوفیانہ فکر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ شاعر کا بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ کائنات کی ہر کیفیت رنج ہو یا راحت، مدح ہو یا مذمت، غم ہو یا سرور در حقیقت ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ وہ شکرِ الٰہی کو مرکز بنا کر یہ بتاتا ہے کہ دل کو جو باطنی نور عطا ہوا ہے، اسی کی بدولت ہر حال میں لطف اور مسرت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں مسرت خارجی حالات کی مرہونِ منت نہیں بلکہ باطنی کیفیت کا نام ہے۔ رونا بھی ہے اک راگ اور ہر اشک کے ساغر سے ابلتی ہے بشاشت جیسے مصرعے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ دکھ بھی تزکیۂ نفس اور روحانی ارتقا کا وسیلہ ہے۔ شاعر کے نزدیک غم نفس کو صیقل کرتا ہے، اخلاق کو مکمل بناتا ہے اور باطن کو روشن کرتا ہے۔ یہ وہی تصور ہے جو صوفیانہ روایت میں الم کو نعمۃ یعنی درد کو نعمت سمجھنے کے رجحان سے جڑا ہوا ہے۔ اسی طرح ہر شے میں جلوۂ حق دیکھنے کا تصور ہر آئینے میں دوست کی تصویر حدت الوجودی رنگ لیے ہوئے ہے۔ کانٹا ہو یا گل، نار ہو یا نور، سب اپنے مقام پر حسنِ الٰہی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ شاعر تضادات کو بھی ہم آہنگی میں بدل دیتا ہے؛ دشمن ہو یا دوست، سبزہ ہو یا کانٹا ہر حال مسرت کا سبب بن سکتا ہے اگر دل حقیقت سے آشنا ہو۔ شاعر میں زندگی کی تلخیوں کو قبول کر کے انہیں معنویت میں ڈھالنے کا حوصلہ موجود ہے۔ وہ قاری کو یہ پیغام دیتا ہے کہ اصل انقلاب باہر نہیں بلکہ دل کے اندر برپا ہوتا ہے؛ جب دل سازِ حقیقت سے ہم آہنگ ہو جائے تو کثرت میں بھی وحدت کی صدا سنائی دیتی ہے، اور ہر حال میں رضا و مسرت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

نظم میں فکری اور روحانی سطح پر دو بڑے موضوعات نمایاں ہیں : وحدتِ حق کا صوفیانہ تصور اور امامِ عالی مقام حضرت حسینؓ کی لازوال قربانی۔ ابتدائی حصے میں شاعر دنیاوی دولت اور ظاہری مرتبوں کی نفی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جسے ہر دم قربِ محبوب حاصل ہو، اسے یاد دہانی کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہاں محبوب سے مراد ذاتِ حق ہے، اور یہی صوفیانہ نقطۂ نظر ہے کہ عبد و معبود کی نسبت میں انا کا شائبہ تک باقی نہ رہے۔ انا الحق کے حوالے سے شاعر خودی کے باطل دعوے کی نفی کرتا ہے اور تسلیم و رضا کو اصل راستہ قرار دیتا ہے۔ اس حصے میں وحدت، انکسار اور اخلاص بنیادی اقدار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اس کے بعد نظم کا رخ تاریخِ کربلا کی طرف مڑتا ہے۔ حضرت حسینؓ کا ذکر محض تاریخی بیان نہیں بلکہ صداقت اور استقامت کی علامت کے طور پر آتا ہے۔ شاعر انہیں باطل کے مقابل حق کا استعارہ بناتا ہے سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ صداقت کا سبق تھا / تلوار کے نیچے بھی وہی نعرۂ حق تھا یہ مصرعے اس ابدی پیغام کو واضح کرتے ہیں کہ حق کی حفاظت جان کی قیمت پر بھی کی جا سکتی ہے، مگر اصول پر سمجھوتا نہیں ہوتا۔ بقول شاعر:

کاش، میرے امتی قرآں کا دفتر دیکھتے
سیرتِ مقداد و سلمان و ابوذر دیکھتے
قصۂ حسنین سنتے، ضربِ حیدر دیکھتے
کس طرح مرتے نہیں، یہ بات مر کر دیکھتے
کاش ان کی عقل میں آتا یہ آسانی کے ساتھ

نعمتِ کونین کا رشتہ ہے قربانی کے ساتھ (۸)

شاعر نے امام حسینؓ کو انبیا کی صفات کے تسلسل میں پیش کیا ہے، مگر سب سے بڑھ کر انہیں محمد ﷺ کا نواسہ کہہ کر ان کی روحانی و اخلاقی نسبت کو نمایاں کیا ہے۔ معرکہ کربلا کا منظر بیان کرتے ہوئے وہ طوفان، سیلاب اور جفا کی تصویریں کھینچتا ہے، مگر امام کا دل بشاش اور پیشانی بے شکن دکھاتا ہے۔ یہ استقامت ہی اصل عظمت ہے۔ یہ کلام عقیدت، تصوف اور تاریخ کے حسین امتزاج کی مثال ہے۔ اس میں فکری گہرائی بھی ہے اور جذباتی تاثیر بھی۔ شاعر نے کربلا کو محض ایک سانحہ نہیں بلکہ ایک زندہ پیغام کے طور پر پیش کیا ہے ایسا پیغام جو ہر دور میں ظلم کے مقابل حق کی جرات عطا کرتا ہے۔ یہی معنوی قوت ان اشعار کو محض مرثیہ نہیں بلکہ ایک ابدی اخلاقی منشور بنا دیتی ہے۔ شاعر دنیا، زر و مال اور اقتدار کی حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے۔ وہ بار بار متنبہ کرتا ہے کہ جس شے کو فنا ہے اسے نعمت نہیں کہا جا سکتا۔ دولت کو وہ خدا نہیں بلکہ محض ایک ذرا سا دیا قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک اصل عزت بے نیازی میں ہے:

جس کو کوئی حاجت ہی نہیں وہ تو خدا ہے (۹)

یہاں صوفیانہ فقر اور توکل کا تصور پوری شدت سے جلوہ گر ہے۔ شاعر قناعت کو ایمان کی علامت اور حرص کو ذلت کا سبب قرار دیتا ہے۔ درمیانی حصے میں دنیا کی حقیقت کو نہایت سخت اور خطیبانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ دنیا کو کثافت کا انبار کہنا مبالغہ ضرور ہے مگر مقصد تنبیہ ہے، تاکہ انسان حرص و غرور سے چونک جائے۔ شاعر تاریخ سے عبرت لینے کی دعوت دیتا ہے شاہوں کی قبروں کی طرف دیکھنے کا مشورہ دے کر وہ اقتدار کی ناپائیداری واضح کرتا ہے۔ پھر کلام کا رخ کربلا کی طرف مڑتا ہے۔ یہاں منظر نگاری، جذبات اور خطابت اپنے عروج پر ہیں۔ حضرت امام حسینؓ کی استقامت، شجاعت اور رضا بالقضا کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ باطل کی فوجی طاقت بھی حق کے سامنے ہیچ دکھائی دیتی ہے۔

ہشیار کہ میں روحِ شجاعانِ عرب ہوں (۱۰)

یہ للکار صرف ایک تاریخی جملہ نہیں بلکہ ہر دور کے باطل کے لیے چیلنج ہے۔ شاعر واضح کرتا ہے کہ حق مٹایا نہیں جا سکتا اور کفر مومن پر غالب نہیں آ سکتا۔ البتہ بعض مقامات پر شدتِ بیان اور مبالغہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ فکری توازن متاثر ہوتا ہے، مگر خطیبانہ شاعری میں یہ انداز تاثیر بڑھانے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ طویل مرثیاتی اور انقلابی کلام اپنے اختتام تک آتے آتے ایک واضح پیغام میں ڈھل جاتا ہے : حق ہمیشہ غالب ہے اور باطل بالآخر مٹ جانے والا ہے۔ باطل کا جو حامی ہے وہ بے نام و نشاں ہے / جو حق کا طرفدار ہے اک شیرِ شہاں ہے یہاں حق کو شیر سے تشبیہ دے کر جرأت، استقلال اور روحانی برتری کو نمایاں کیا گیا ہے۔ شاعر کے نزدیک اصل قوت افراد کی نہیں بلکہ قوتِ حق کی ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ بزدل میں بھی جب حق کی روح داخل ہو جائے تو وہ جری بن جاتا ہے۔ یہ تصور صوفیانہ بھی ہے اور انقلابی بھی۔ پھر میدانِ کربلا کی منظر کشی اپنے عروج پر پہنچتی ہے۔ حضرت امام حسینؓ کی تلوار، ان کی للکار، دشمن کا اضطراب، صفوں کا ٹوٹنا یہ سب محض جنگی مناظر نہیں بلکہ ایک اخلاقی معرکے کی علامت ہیں۔ شاعر بار بار واضح کرتا ہے کہ یہ معرکہ افراد کا نہیں بلکہ اصولوں کا ہے کہ ایک طرف اقتدار، حرص اور جبر دوسری طرف صداقت، خلافت اور ایمان امام حسینؓ کی شہادت کے منظر میں جذبات انتہائی شدت اختیار کر لیتے ہیں۔ زینبؓ کی فریاد، علی اکبرؓ اور عباسؓ کا ذکر، پیاسا گلا، تیر اور

تلوار یہ سب مل کر ایک ایسا دردناک مگر باوقار منظر بناتے ہیں جس میں شکست دکھائی دیتی ہے مگر دراصل یہی فتح ہے۔ شاعر کا نقطۂ عروج ان مصرعوں میں ظاہر ہوتا ہے:

اے قوم! وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ
اسلام ہے پھر تیرِ حوادث کا نشانہ
مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو
لازم ہے کہ ہر فرد حسین ابنِ علی ہو (۱۱)

یہاں کربلا تاریخ نہیں رہتی بلکہ حال کا تقاضا بن جاتی ہے۔ شاعر قوم کو جھنجھوڑ رہا ہے کہ اگر حق خطرے میں ہو تو ہر دور میں حسینی کردار درکار ہوتا ہے۔ میری رائے میں اس کلام کی سب سے بڑی قوت اس کی حرارتِ ایمانی اور خطیبانہ آہنگ ہے۔ اس میں جذبات کی شدت، منظر نگاری کی توانائی اور پیغام کی صراحت تینوں موجود ہیں۔ بعض مقامات پر مبالغہ اور تکرار ضرور ہے، مگر مرثیہ اور انقلابی شاعری کی روایت میں یہی انداز تاثیر کو بڑھاتا ہے۔ یہ کلام صرف غمِ حسینؓ نہیں بلکہ عزمِ حسینؓ کی دعوت ہے یعنی ظلم کے مقابل ڈٹ جانا، خواہ قیمت کچھ بھی ہو۔ یہی پیغام اسے محض مرثیہ نہیں بلکہ ایک زندہ اخلاقی منشور بنا دیتا ہے۔

یہ نعت فکری گہرائی، دردمندی اور اصلاحی جذبے سے لبریز ہیں اور اپنے اندر نعت، مرثیہ اور اصلاحِ ملت تینوں کی کیفیات کو سموئے ہوئے ہیں۔ آغاز میں حضور اکرم ﷺ کی شانِ فقر کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ وہ فقر جس میں "کج کلاہی" بھی ہے اور شاہی بھی۔ یعنی بظاہر سادگی اور سپاہیانہ زندگی، مگر باطن میں روحانی اقتدار اور قانونِ الٰہی کی کامل پیروی۔ "جس نے قلبِ تیرگی سے نور پیدا کر دیا" اور "جس کی جاں بخشی نے مردوں کو مسیحا کر دیا" جیسے مصرعے بعثتِ نبوی ﷺ کو اخلاقی اور روحانی احیا کا استعارہ بنا دیتے ہیں۔ دوسرے حصے میں شاعر حضور ﷺ کی آفاقی عظمت کو دوام بخشتا ہے۔ "آندھیاں تیرے چراغوں کو بجھا سکتی نہیں" میں استقامت اور ابدیت کا تصور نمایاں ہے۔ یہ اس یقین کا اظہار ہے کہ پیغامِ رسالت وقتی نہیں بلکہ قیامت تک رہنمائی کا سرچشمہ ہے۔ اسی تسلسل میں نسل و رنگ کے امتیاز کے خاتمے اور اخوتِ انسانی کے قیام کا ذکر، اسلام کے انقلابی سماجی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔

تاہم نظم کا اصل دردمندانہ لہجہ اس وقت ابھرتا ہے جب شاعر ملتِ مسلمہ کی موجودہ حالت پر نظر ڈالتا ہے۔ "ذکرِ دیں ہونٹوں پہ ہے، دنیا کی گھاتیں دل میں ہیں" داخلی تضاد کی نہایت بلیغ تصویر ہے۔ یہاں عقیدت کے ہجوم میں عملی وفا کی کمی پر ایک خاموش مگر کربناک شکوہ موجود ہے۔ شاعر گویا یہ باور کراتا ہے کہ محبتِ رسول ﷺ محض نعرہ یا رسم نہیں، بلکہ کردار، عدل، ایثار اور قربانی کا تقاضا کرتی ہے۔ بعد کے اشعار میں سماجی ناہمواری، غربت، بے حسی اور قیادت کے فقدان کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ "کارواں ہے، اور میرِ کارواں کوئی نہیں" اجتماعی انتشار اور فکری بے سمتی کی علامت ہے۔ شاعر قرآن کی تعلیمات اور صحابۂ کرامؓ اور حضرت علیؓ کے عملی نمونوں کی طرف رجوع کی تلقین کرتا ہے، تاکہ امت دوبارہ قربانی، علم اور اتحاد کے راستے پر گامزن ہو سکے۔ یہ نعت محض مدحِ رسول ﷺ نہیں بلکہ ایک بیدار کن اصلاحی منشور ہے، جس میں عشقِ رسول ﷺ کو اخلاقی انقلاب، سماجی انصاف اور عملی جدوجہد سے وابستہ کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جوش ملیح آبادی۔ پیغمبرِ اسلام۔ دہلی: بازار فتح پوری، ۱۹۲۰ء۔ ص۳

۲۔ ایضاً۔ ص۵

۳۔ محمد اقبال۔ بال جبریل۔ لاہور: تاج کمپنی، ۱۹۳۵ء۔ ص۸۳

۴۔ جوش ملیح آبادی۔ پیغمبرِ اسلام۔ ص۷،۶

۵۔ ایضاً۔ ص۱۳

۶۔ محمد اقبال۔ بال جبریل۔ ص۱۵۴

۷۔ جوش ملیح آبادی۔ پیغمبرِ اسلام۔ ص۱۲

۸۔ ایضاً۔ ص۳۶

۹۔ ایضاً۔ ص۶۴

۱۰۔ ایضاً۔ ص۷۳

۱۱۔ ایضاً۔ ص۹۵،۹۴